© rasailojaraid.com

مولوی محمد سعید مرحوم
سابق ایڈیٹر پاکستان ٹائمز لاہور

ترتیب و تلخیص
محمد عمر فاروق

شاہ جی اور قافلہ احرار

مولوی محمد سعید مرحوم پاکستان کی انگریزی صحافت کے معمار بزرگوں میں سے تھے۔ ڈان، پاکستان ٹائمز، ٹائمز آف کراچی اور سول اینڈ ملٹری گزٹ میں کام کیا۔ پاکستان ٹیلی ویژن سے بھی منسلک رہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ مرحوم اردو کے صاحب اسلوب نثر نگار تھے۔ ۱۹۹۱ء میں بعمر اسّی سال وفات پائی۔ ان کی ذاتی یادداشتوں پر مشتمل کتاب "آہنگ بازگشت" سے مرتب کیا گیا یہ مضمون ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

انگریز جب آزادی مذہب کی آڑ میں غیر جانبدار ہو گیا تو گھٹیا قسم کے چند ہندو مصنفوں اور ریفارمروں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نجاست اچھالنے کو پیشہ بنا لیا۔ بہر کیف دلی میں عبدالرشید کے ہاتھوں شردہانند کیفر کردار کو پہنچا۔ لاہور میں علم الدین کے ہاتھوں راجپال اور کراچی میں عبدالقیوم کے ہاتھوں شاتمان رسول ﷺ کے اس انجام نے اس تحریک کا خاتمہ کر دیا۔

مسلمان قوم نے اپنے غیظ و غضب کے اظہار میں کسی مداہنت کو روا نہیں رکھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک جلسہ میں برملا کہہ دیا۔ "اللہ سے گستاخی کرنے والوں سے تو وہ خود نپٹ لے گا۔ لیکن رسول ﷺ کی طرف اٹھنے والی انگلی کو ہی نہیں، شانے سے بازو تک کو کاٹ دیا جائے گا"

یہ محض حادثہ نہیں تھا کہ خلافت ایجی ٹیشن کا اتحاد و اتفاق ہندو مسلم فسادات کے خونیں سلسلے کی نذر ہو گیا۔ اور آزادی کی قرارداد پاس ہوتے ہی شاتمان رسول کی ایک کھیپ پیدا ہو گئی۔ صاف عیاں ہو چکا تھا کہ یا آزادی کا خواب پریشان کیا جا رہا ہے یا آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر دکھائی جا رہی ہے۔

بہر کیف کچھ عوامل ضرور ایسے کار فرما تھے۔ خواہ وہ نفسیاتی ہوں یا سیاسی۔ جو قوموں کے اتحاد کے درمیان متواتر حائل ہو رہے تھے۔

ہندو ڈوگروں کے غرور کی انتہا بالآخر قرآن پاک کی توہین کی صورت میں ظاہر ہوئی، کشمیری کہ جنھوں نے بے چارگی میں برسوں اپنے بچوں کے گلگوں چہروں پر طمانچے پڑتے دیکھے تھے اس سانحہ پر ان کے ہاتھ سے بھی دامن صبر چھوٹ گیا۔ وہ اٹھے اور ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے روز اپنے جابر حکمران کے ساتھ ٹکرا گئے۔ یہ تاریخی تصادم امیرا کدل پر ہوا۔ حوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ کشمیریوں نے ڈوگرے سپاہیوں سے بندوقیں چھین چھین کر دریا میں پھینک دیں۔ پشاور کے بعد سری نگر شمالی ہندوستان کا دوسرا شہر تھا جو ان دنوں مسلمانوں کے خون سے رنگین ہو رہا تھا۔

وادیِ کشمیر میں جو جنگ ڈوگروں کے خلاف جاری ہو چکی تھی۔ اس کی بازگشت پہاڑوں کے دامن میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھیلے ہوئے پنجاب کے ہر قریہ اور ہر شہر میں ہوئی۔ احرار کے ابتدائی ایام تھے۔ احرار کی بے پناہ خطابت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی موضوع مناسب نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے پنجاب کے طول و عرض میں اپنی شعلہ بیانی سے آگ لگادی۔ سرخپوش ابھی تک قصہ خوانی کے معرکہ خونیں سے پوری طرح نہ ابھر سکے تھے۔ خاکسار تحریک کے خطوط ابھی تک غیر مرئی تھے۔ لیگ اپنی مجبوریوں اور کانگرس اپنی مصلحتوں کی بناء پر اس تحریک میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ کشمیر ایجی ٹیشن کی قیادت چنانچہ احرار کے ہاتھ میں آگئی۔ اور وہ اس کے لئے موزوں تھے۔ مسئلہ مسلمانوں کی آزادی اور ان کے مذہبی تحفظ کا تھا۔ انہیں دو اجزاء سے احرار کی حکمت عملی نے ترکیب پائی تھی۔ قید و بند سے وہ خائف نہیں تھے۔ ان کی قیادت نے اگست ۱۹۳۱ء میں تیس ہزار آدمیوں کو ڈوگروں کی جیلوں اور کیمپوں میں بھیج دیا۔ سیالکوٹ شہر کا کوئی جوان ایسا نہ ہوگا جس نے سچیت گڑھ کے کیمپ کے خاردار تاروں کے پیچھے چند دن نہ گزارے ہوں۔ قافلے جب ظفر علی خان کا نغمہ "کشمیر چلو کشمیر چلو" گاتے ہوئے نکلتے تو منظر دیدنی ہوتا۔ بیویاں خاوندوں کو اور مائیں بچوں کو بڑی دعاؤں اور ولولوں کے ساتھ رخصت کرتیں۔

پنجاب کے ہندو پریس نے حسب معمول اس مسئلے کو اسی نگاہ سے دیکھا جس سے وہ ہر مسئلے کو دیکھنے کا عادی تھا۔ انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ ایک خطے کے لوگ وہاں کے جابر حکمرانوں کے پنجۂ استبداد کی گرفت سے نکلنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مہاراجے کے نام کی رعایت سے اسے بھی ہندو مسلم مسئلہ بنا دیا۔ چنانچہ آریہ سماجی پرچارک جگہ جگہ پھیل گئے۔ مسلمان والیان ریاست کے ظلم و جور کے ایسے افسانے گھڑے گئے کہ تاریخ انگشت بدنداں رہ گئی۔

ان دنوں احرار کا ستارہ بڑے عروج پر تھا۔ پورا پنجاب انکی مٹھی میں تھا۔ عوام سے اتنا رابطہ یونینسٹ پارٹی اور اس کے ارباب بندوبست کے لئے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ اگلے چند برسوں میں یونینسٹ پنجاب کی سرزمین پر سر فضل حسین کی قیادت میں بلاشرکت غیرے اپنا پھریرا لہرانا چاہتے تھے۔ احرار تو ان کے نزدیک خیر کسی شمار قطار میں نہیں تھے۔ وہ لیگ تک کو اپنی قلمرو میں نہیں آنے دینا چاہتے تھے۔ مجلس احرار وہ پہلی جماعت تھی جو پنجاب کے جاگیرداروں اور سرکار پرستوں کے لئے بے اطمینانی کا باعث تھی اور جس کا رابطہ براہ راست عامتہ الناس سے تھا بہر کیف دونوں ابھرتی ہوئی قوتوں میں ٹھن گئی۔ احرار کہ جو مستر دراجواڑے کو سرنگوں کر چکے تھے۔ اور یونینسٹ کہ جن کی پشت پر انگریز کا دبدبہ اور سر فضل حسین کی زیر کی تھی۔ تحریک کشمیر کے دوران ہی اس تناؤ کے آثار ہویدا ہو چکے تھے۔ ہری سنگھ ڈوگرے کی تذلیل کے بعد انہوں نے اپنا رخ سر فضل حسین کی جانب کر لیا۔

لائلپور کے دھوبی گھاٹ میں ان کا اجتماع ایسا فقید المثال تھا کہ چاروں طرف احرار کی قوت کی دھوم مچ گئی۔ احرار نے لائلپور سے فارغ ہو کر پسرور میں ڈیرے ڈال دیئے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب اینٹوں کے ایک ویران بھٹے کے پاس کھلے میدان میں ان کا پنڈال نصب ہوا۔ آبادی کے لحاظ سے پسرور کا جلسہ بھی کچھ کم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کامیاب نہیں تھا۔ جلسے کے دوران مجھے ایک دوست چودھری علی محمد باجوہ نے جو لاہور سے آئے تھے۔ بتایا کہ مسجد شہید گنج کا تنازعہ بڑی خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ اور لاہوری مسلمانوں کی یورش محلہ دارا شکوہ پر برابر ہو رہی ہے۔

۹ جولائی ۱۹۳۵ء کا دن شہید گنج کے پرستاروں کے لئے قیامت کا دن تھا۔ لاہور کے دلی دروازہ کے باہر محلہ دارا شکوہ پر مسلمانوں کی یورش ہو رہی تھی۔ ناکہ خار دار تاروں سے بند تھا۔ کوتوالی کی برجیوں پر گورا فوج ہتھیار نصب کئے بیٹھی تھی۔ جوانان!! بہ ہزار چھاتیاں کھولے موجوں کی صورت میں آگے بڑھتے جاتے اور موت کے گھاٹ اترتے جاتے۔ یہ خبر مجھے احرار کے جلسہ میں ملی۔ چنانچہ دوپہر کے کھانے کے وقت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پسرور کی سرکلر روڈ پر کاشانہ میں ان کا قیام تھا۔ کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ میں نے سلام عرض کیا۔ میں نے جاتے ہی پوچھا۔

"لاہور میں جو گولی چل رہی ہے اسکی ذمہ داری کس پر ہے؟" سید جی کچھ کہہ نہیں پائے تھے کہ مولانا لدھیانوی نے گرج کر کہا۔ "جاؤ کرم آباد، ظفر علی خان سے پوچھو" پیشتر اس سے کہ میں کچھ اور عرض کرنے کی جسارت کرتا شاہ صاحب نے مجھے اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھالیا۔ بڑی شفقت سے خیر و عافیت پوچھی۔ میرے جذبے کو سراہا اور پھر کسی قدر جوش میں آکے پوچھا۔ "اگر پنجاب میں خانہ جنگی چھڑ گئی تو تیار ہو؟"

میں خاموش رہا۔ پھر خود ہی کہنے لگے "آج ہی لاہور جا کے عورتوں کے برقعے اتروا سکتا ہوں لیکن اگر پنجاب میں خون کی ندیاں بہہ نکلیں تو کون ذمہ دار ہوگا؟"

پچھلے پہر مولانا حبیب الرحمن کو جلسہ میں تقریر کرنا تھی۔ تقریر کے دوران انہوں نے احرار کو الجھانے کے جو منصوبے بن رہے تھے انکا ذکر کیا اور کہا کہ۔

"میں ایسا نااہل جرنیل نہیں ہوں کہ جو فوج کو دو محاذوں پر ٹکرا کر فنا کر دے"

شہید گنج کا قضیہ طول کھینچ گیا۔ اور مسجد تھوڑے سے رد و بدل کے بعد گوردوارے میں بدل دی گئی۔ واقعات کی رواروی میں نہ صرف احرار ہی کچلے گئے بلکہ مولانا ظفر علی خان بھی نہ ابھر سکے۔ ظفر علی خان اور احرار کے درمیان بڑے بڑے قلمی اور زبانی مجادلے ہوئے۔ اسی زمانے میں ایک دوسرے کے مجمعوں کو منتشر کرنے کی ایسی ترکیبیں سوچی جاتیں کہ لوگ عش عش کر اٹھتے۔ سیالکوٹ میں مولا بخش کے تالاب کو خشک کر کے وہاں احرار نے اپنا کنونشن جمایا۔ سیالکوٹ احرار کا ناقابل تسخیر حصار سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے یہ کنونشن اپنے رکھ رکھاؤ اور تزک و احتشام کے اعتبار سے بڑے برتن کی بڑی کھرچن ثابت ہوا۔

مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی تقریر کر رہے تھے کہ جلسہ گاہ کے ایک کونے سے ظفر علی خان زندہ باد کا نعرہ بلند ہوا۔ دو چار آوازیں اور شامل ہو گئیں۔ مولانا جلال میں آگئے اور پکارے۔ "والینٹئرز نکال دو ان مرزائیوں کو۔ ظفر علی خان بہادر ہے ہم اس کے وارث ہیں۔ ہم بہادر ہیں، ظفر علی خان ہمارا وارث ہے، بہادروں کی محفل میں ان بزدلوں کا کیا کام؟" نعرہ باز ہاتھوں ہاتھ دروازے تک اور پھر سڑک تک پہنچا دیئے گئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور جلسہ جاری رہا۔

جلسے کے ایک اجتماع کی صدارت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کی۔ تلاوت قرآن پاک ہو رہی تھی۔ کہ مولانا حبیب الرحمن اپنے خیمے سے بر آمد ہو کر جلسہ گاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ ان کے آگے آگے بینڈ مارچنگ کی دھن بجا رہے تھے۔ اور نعرے لگ رہے تھے۔ آوازیں ہمیں جلسہ گاہ سے برابر آرہی تھیں۔

مولانا مظہر علی اظہر کی تقریر بڑی معرکہ آرا تھی۔ ایک مقام پر انہوں نے انگریز حکمرانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا "مسلمانوں کے جذبات سے مزید کھیلنا بغاوت کو دعوت دینا ہے" اس جملے پر شاہ جی کرسیٔ صدارت سے اٹھ کر فرط جوش سے اسٹیج پر ٹہلنے لگے۔

مولا بخش کے تالاب کا جلسہ احرار کا دم واپیس تھا۔

جس شخص کو لاہور کا وہ دور دیکھنا نصیب ہوا ہے وہ جانتا ہے کہ جو قوم دو پشتوں سے عافیت کوش اور مصلحت اندیش ہو چکی تھی اس کی اگلی نسل کی تربیت کہاں ہو رہی تھی۔ ان شکستہ دیواروں سے عطاء اللہ شاہ بخاری کی للکاریں ٹکرا چکی ہیں۔ موچی دروازے نے اقبال کا جواب شکوہ سنا۔ دلی دروازے نے ظفر علی خان کے نغمے اور نعتیں سنیں ہیں۔

جلسے جس اہتمام سے جمائے جاتے اسی اہتمام سے برہم بھی کئے جاتے۔ اس دور میں تو گولی اور بم نے جلسوں کے اجڑنے کا سارا لطف غارت کر دیا ہے۔ ان دنوں جے جمائے جلسے محض پھپھڑوں کے زور سے ہوا میں اڑا دیئے جاتے۔ شروع شروع میں تو جلسہ گاہ کے گوشوں پر بڑے نیچے سروں میں پھبتیوں، ضلع جگتوں، طعنوں اور نعروں کی گونج سنائی دیتی کچھ دیر تک تو زخمہ ور کی تیز دستی انہیں دبائے رکھتی۔ پھر آواز اسٹیج کی جانب قدم بہ قدم بڑھتی سنائی دیتی تا آنکہ والنٹیئر جاتے کود جانے اور پھر یک لخت دست بدستے دگرے کا سماں پیدا ہو جاتا۔ گھڑی دو گھڑی بعد کوئی ٹوٹی ہوئی طناب یا کسی نقش پا کی شوخی کہے دیتی کہ ابھی کوئی اس راہ سے گزرا ہے۔

لاہوریوں کو ایک مرتبہ ایسے ہی موڈ میں پا کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے للکار کر کہا۔ "وہی دلی دروازہ ہے۔ وہی پیپل کا پیڑ۔ برس دن کے بعد لوٹ کے آیا ہوں۔ پھر برسا لو پتھر۔ خدا کی قسم تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ اس لئے کہ عبد اللہ کے یتیم بیٹے ﷺ نے مجھے یہی سکھایا ہے"

مجھے یاد ہے کہ آخری جملے نے پوری محفل کو بیخود کر دیا تھا۔ میرے قریب گھاس پر ہی (مرزائیوں) لاہوری جماعت کے مولوی صدر الدین بیٹھے تھے وہ ہڑبڑا کے پاؤں کے بل بیٹھ گئے اور ان کے منہ سے اللہ اللہ اس طرح بے ساختہ نکلا کہ جیسے بجلی کی کڑک نے انہیں نیند سے بیدار کر دیا ہو۔

آج جب کبھی دلی دروازے سے گزرتا ہوں اور اس اداس اور کہنہ سال پیپل کو دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کہہ رہا ہو۔

سنگ در دیوار ہا از شوخیٔ طفلاں نماند
شہر گر ویراں شود، خود رالبصرا امیکشم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(بچوں کی شوخیوں نے کوئی پتھر دیواروں میں نہیں چھوڑا اور اگر شہر یوں ویران ہو گیا تو میں صحرا کو چل دوں گا)

علی گڑھ کی مرکزی حیثیت کا اندازہ اس ایک جملے سے ہوتا ہے جو سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک مرتبہ یونین ہال میں تقریر شروع کرنے سے قبل کہا۔ کہ جب لاہور سے چلا تو احباب نے کہا کہ اگر علی گڑھ کے مسلمانوں سے خطاب کرنا ہے تو شہر کی جامع مسجد میں تقریر کرنا اور اگر پورے ہندوستان کے مسلمانوں سے کچھ کہنا ہے تو یونیورسٹی میں تقریر کرنا۔

علی گڑھ نفسوں کے اندر تغیر لانے کا اہتمام تھا۔ علی گڑھ نے اگرچہ ابتداء ہی سے بڑے سیاسی معرکے دیکھے تھے۔ اور خود اس کا اپنا وجود ایک سیاسی اقدام تھا۔ لیکن جس دور میں سے یہ اس صدی کے چوتھے عرشے میں گزر رہا تھا۔ وہ بڑا فیصلہ کن تھا۔

اس عرصے میں علی گڑھ میں چار عظیم ہستیاں آئیں۔ حکمرانوں کے جذبات کے ترجمان لارڈ لوتھین کہ جن کے بارے میں عام تاثر تھا کہ وہ وائسرائے بنکر آرہے ہیں۔ کانگرس کے ذہن کی ترجمان مسز سروجنی نائیڈو، مسلمان وطن پرستوں کے نمائندہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مسلمانوں کے ابھرتے ہوئے سواد اعظم کے نمائندہ قائد اعظم محمد علی جناح۔ یہ مشاہیر اپنے اپنے رنگ میں فقید المثال تھے۔

سروجنی نائیڈو شاعرہ تھیں۔ اپنے ہم عصر لوگوں میں وہ قائد کی بے حد مداح تھیں۔ ثقافت انہیں مسلمانوں کی مرغوب تھی۔ اور سیاست گاندھی جی کی۔ بہادر یار جنگ کی خطابت کی دلدادہ تھیں اور خود بھی سحر بیان مقررہ تھیں۔

قائد اعظم مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سمبل بنکر ابھرے منطق ان کی یخ بستہ ہوتی اور خطابت شعلہ فشاں، دلائل پر جائیے تو مفر نہیں تھا۔ خطابت پر جائیے تو رکنا محال ہوتا۔

عطاء اللہ شاہ بخاری خوبرو، خوش گلو، خطابت کی ہر رمز کے شناسا اسٹیج پر آتے تو آنکھوں کو بھلے لگتے بولتے تو فردوس گوش اور تقریر جیسے جیسے ابھرتی دماغ دل کے حق میں دست بردار ہو جاتا اور دل شاہ جی کی انگلیوں میں ہوتا۔ شاہ جی نے یونین ہال میں ایک معرکہ آراء تقریر میں

الیوم اکملت لکم دینکم

کی تفسیر بیان کی۔ یونین کے صدر کو گمان گزرا کہ تقریر شائد فرقہ وارانہ ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے شاہ جی کی خدمت میں عرض کی کہ فرقہ وارانہ تقریر یونین کے قواعد کی رو سے ممنوع ہیں۔ شاہ جی نے اطمینان دلایا کہ یونین کی ہر روایت کی پاسداری کی جائے گی۔

تقریر شروع ہوئی۔ اس حال میں کہ اسٹیج پر دیگر حضرات کے علاوہ رشید احمد صدیقی جیسے بذلہ سنج اور شستہ مذاق اور ہادی حسن جیسے سحر بیان بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہ جی جب ظرافت پر آتے تو رشید احمد ہنسی ضبط نہ کر سکتے۔ اور جب خطابت کی بلندیوں کو چھوتے تو ہادی حسن جھوم جھوم جاتے۔ ان کی تقریر کا نقطہ عروج وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سین تھا جب انہوں نے اپنے رومال کی جھولی بنا کر آگے بیٹھے ہوئے بچوں سے کہا کہ آؤ بچو مٹھائی لیتے جاؤ۔ ایک ایک بچہ آگے بڑھتا، شاہ جی اس کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتے۔ جب آخری بچہ آیا تو اس کی جھولی میں سب کچھ الٹ دیا اور جب اس کے بعد بھی ایک بچہ اچانک اٹھ بیٹھا تو شاہ جی نے اپنا خالی رومال ہوا میں لہرا کر وجد آفرین قرأت میں الیوم اکملت لکم دینکم کا اعلان کر دیا۔ یہ آیت اس سوز اور حسّیت سے پڑھی کہ پورا ہال تحسین کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اقبال کے مصرعہ "داد مارا آخریں جامے کہ داشت" کو یوں حقیقت کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے آنکھوں نے اس روز دیکھا۔ شاہ جی کو زبان پر جو عبور حاصل تھا۔ اس پر انہوں نے اپنے فرکا دلی اور لکھنؤ والوں کو خطاب کر کے اظہار یہ کہہ کر کیا "برس دن کے بعد اردو میں تقریر کر رہا ہوں کہیں زبان کی غلطی کر جاؤں تو ٹوک دینا"

میں تقریر سن رہا تھا اور میرے ذہن میں شاہ جی کی ایک اور ہی تصویر ابھر رہی تھی۔ جونڈے کا دیہاتی اسٹیج ہے، ان پڑھ لوگوں کا ہجوم ہے، شاہ جی پنجابی میں تقریر کر رہے ہیں اور ان سادہ ورق لوگوں کے دلوں کو گرماتے جا رہے ہیں۔ یا پھر گلّو شاہ کے میلے میں منبر بچھا ہوا ہے۔ اور وہ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اور لوگ سر دھن رہے ہیں۔ اسٹیج علی گڑھ کا ہو یا موچی دروازے کا، منبر جامع مسجد دہلی کا ہو یا گلّو شاہ کا۔ شاہ جی کا جادو یکساں ایمان افروز ہوتا۔

قافلہ احرار جو گزشتہ پندرہ برسوں میں بڑے جانگداز نشیب و فراز دیکھ چکا تھا اب اس مقام پر پہنچ گیا کہ کانگریس ان کے اپنے نزدیک اب ایک فاشسٹ جماعت ہو چکی تھی۔ چنانچہ نوابزادہ نصر اللہ خان نے کہ جوان دنوں احرار کے قافلہ سالار تھے۔ ایک بیان جاری کیا کہ چونکہ کانگریس کے ہاتھوں ملک کا امن تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اپنی سیاسی سمت پر نگاہ ثانی کی جائے اور اب وہ پالیسی اختیار کی جائے جو مسلمانوں کی امنگوں کی ترجمان ہو" احرار نے بہار اور نواکھلی کے فسادات کی مذمت کی اور اپنی سعی کو کاملاً "ہندی مسلمانوں کی رستگاری" کے لئے وقف کر دیا۔

احرار کی سیاست اگرچہ بڑے نشیب و فراز سے گزرتی رہی تھی۔ تاہم وہ ایک بات میں بڑے ثابت قدم رہے اور وہ ان کی قادیان دشمنی تھی۔ انہیں جس شہر اور جس اسٹیج سے موقعہ ملا انہوں نے اس دشمنی کا اظہار بھرپور انداز میں کیا۔

ایک روز (ڈان کے) دفتر میں آ کے بیٹھا ہی تھا کہ معلوم ہوا سید عطاء اللہ شاہ بخاری آرام باغ (کراچی) میں تقریر کرنے والے ہیں۔ اخبار کو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لئے دوسروں کے سپرد کر کے آرام باغ چلا گیا۔ شاہ جی کو سنے ہوئے مدت ہوئی تھی اور پاکستان بننے کے بعد سے انہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔ تقریر شروع ہوئی تو وہی اعتماد، وہی خوش الحانی اور خوش گفتاری۔ تقریر ہر اس خوبی سے مزین تھی جو کسی بڑے خطاب کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے۔ تقریر کا معتد بہ حصہ مرزائیت کے خلاف تھا۔ میں تقریر کے دوران ہی دفتر چلا آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ ربع صدی اختتام کو پہنچی جس میں نطق کی سحر کاری کو ہزار جلوؤں میں دیکھا۔

© rasailojaraid.com